فلسطین کا مستقبل اور یہودی عالم سے گفتگو

افتخار گیلانی ○

مشرق وسطیٰ میں جہاں اس وقت امریکا اور ایران کے مابین کشیدگی عروج پر ہے، وہیں فلسطین کے حوالے سے امریکی صدر ٹرمپ، یورپی یونین، ان کے عرب حکمران اور اسرائیل ایک فارمولے کو حتمی شکل دینے میں مصروف ہیں، جس کو 'ڈیل آف سنچری' کا نام دیا جا رہا ہے۔ چند ماہ قبل دہلی کے دورے پر آئے ایک یہودی عالم ڈیوڈ روزن نے عندیہ دیا تھا کہ: ''سابق امریکی صدر بارک اوباما جس خاکے کو تیار کرنے میں ناکام ہو گئے تھے، ٹرمپ، سعودی عرب و دیگر عرب ممالک کے تعاون سے فلسطین کے حتمی حل کے قریب پہنچ گئے ہیں''۔

آئرلینڈ کے چیف ربی ڈیوڈ روزن، اسرائیل کی چیف ربائیٹ، یعنی مذہبی امور کے رکن ہیں اور امریکی جیوش کونسل (AJC) کے سربراہ بھی رہ چکے ہیں۔ یہ واشنگٹن میں طاقت ور ترین لابی ہے، جس نے 'بھارت-امریکا' جوہری معاہدے کو کانگریس اور سینیٹ سے منظوری دلوانے میں اہم کردار ادا کیا تھا۔ مشرق وسطیٰ میں خصوصاً اسرائیل اور سعودی عرب کے درمیان بیک چینل تعلقات کے حوالے سے وہ خاصے سرگرم چلے آ رہے ہیں۔ وہ سابق سعودی فرمانروا شاہ عبداللہ کی ایما پر قائم کنگ عبدالعزیز انٹرنیشنل سینٹر فار انٹر ریلیجنز اینڈ کلچر ڈائیلاگ کے بورڈ ممبر بھی ہیں۔ میں نے جب ان سے پوچھا کہ: ''جہاں ایک طرف اسرائیل نے فلسطینیوں کا ناطقہ بند کر رکھا ہے، آئے دن ان پر حملے ہو رہے ہیں، آخر امن آئے گا تو کیسے؟'' تو ان کا کہنا تھا کہ اسرائیل کی تمام تر جارحانہ کارروائیوں کے باوجود ایک حقیقت کا ادراک یہودیوں اور اسرائیلی حکام کو ہو گیا ہے کہ

○ انقرہ، ترکی

وہ ناقابلِ تسخیر نہیں ہیں۔ ویسے تو اس بات کا اندازہ ۱۹۷۳ء کی جنگِ مصر اور بعد میں ۲۰۰۶ء میں جنگِ لبنان کے موقعے پر ہی ہوگیا تھا، مگر حالیہ کچھ عرصے سے یہ بات شدت کے ساتھ محسوس کی جارہی ہے۔اس لیے دنیا بھر کے یہودی چاہتے ہیں کہ اس سے پہلے کہ تاریخ کا پہیہ کوئی اور رخ اختیار کرے، اسرائیل کی سرحدوں کا تعین کرکے، پڑوسی ممالک سے اس کا وجود تسلیم کرایا جائے''۔روزن کا کہنا تھا کہ: ''توسیع پسندی اب کسی بھی صورت میں اسرائیل کے مفاد میں نہیں ہے۔ فوجی اعتبار سے اسرائیل چاہے تو سرحدوں کو وسیع کرنے کی قوت رکھتا ہے، مگر پھر مقبوضہ علاقوں کی آبادی کو بھی ملک میں شامل کرنا پڑے گا، جس سے ظاہر ہے کہ یہودیوں کے اقلیت میں تبدیل ہونے کا خدشہ لاحق ہوگا۔ دنیا بھر میں یہودی محض ایک کروڑ ہیں، جن میں ۶۰ لاکھ کے قریب اسرائیل میں رہتے ہیں۔ اس لیے فلسطینیوں سے زیادہ اسرائیلیوں کے لیے بھی اپنی بقا کے لیے سرحدوں کا تعین کرنا ضروری ہے۔ ٹرمپ کے لیے شاید اس لیے بھی ضروری ہے کہ شام کے بحران میں اگر کسی کو سب سے زیادہ فائدہ حاصل ہوا ہے تو وہ روسی صدر ولادی میر پوتن ہیں۔ اس سے قبل شاید ہی روس کا مشرقِ وسطیٰ میں اس قدر مفاد وابستہ تھا۔

جب میں نے ربی ڈیوڈ روزن سے پوچھا کہ: ''اسرائیلی وزیراعظم بنیامن نیتن یاہو تو خود کئی بار دو ریاستی فارمولے کو مسترد کرچکے ہیں؟'' تو ان کا کہنا تھا کہ حکومتوں کے رویے میں اُتار چڑھاؤ آتے رہتے ہیں، مگر یک ریاستی حل کسی بھی طور پر اسرائیل کے مفاد میں نہیں ہے۔ ایک اسٹیٹ کا مطلب ہے کہ مستقبل میں عرب اسٹیٹ کا قیام اور یہودی اسٹیٹ کا خاتمہ''۔ ان کا کہنا تھا کہ: ''اسرائیلی علاقوں میں مسلمانوں کی افزایش نسل یہودیوں سے کئی گنا زیادہ ہے۔ ۱۹۶۷ء میں عرب، اسرائیل کی آبادی کا ۱۴ فی صد تھے، جو اب لگ بھگ ۲۲ فی صد ہوچکے ہیں۔ یہ وہ مسلمان ہیں جنھوں نے اسرائیل کی شہریت اختیار کی ہوئی ہے اور وطنی طور پر اسرائیلی-عرب کہلاتے ہیں۔ اس حقیقت کے پیش نظر اسرائیل کسی بھی صورت میں ۵۰ لاکھ فلسطینی مہاجروں کو واپس لانے کا متحمل نہیں ہوسکتا ہے۔ جن ممالک میں وہ پناہ گزین ہیں، انھی کو ان کی مستقل رہایش کا بندوبست کرنا پڑے گا، کیوں کہ مغربی کنارہ اور غزہ بھی شاید ان کو بسا نہیں پائے گا''۔

ربی ڈیوڈ روزن کا مزید کہنا تھا کہ: ''القاعدہ اور داعش جیسی تنظیمیں اسرائیل کی نسبت

عرب ممالک کے لیے زیادہ خطرہ ہیں۔اس لیے اسرائیل کے ساتھ معاہدہ کرنا ان عربوں کے مفاد میں ہے۔اس وقت خلیجی ممالک سعودی عرب، اردن، مصر وغیرہ سبھی مسئلہ فلسطین کا حل چاہتے ہیں، کیونکہ فلسطین کے نام پر ہی دہشت گرد تنظیمیں مسلم نوجوانوں کو اپنی طرف راغب کرتی ہیں اور تشدد کا جواز فراہم کراتی ہیں''۔ان کا کہنا تھا کہ اس مسئلے کے حل کی صورت میں مسلمانوں اور یہودیوں کے مابین مکالمے کا دروازہ بھی کھل سکتا ہے''۔انھوں نے یاد دلایا کہ: ''یہودی، اسلام سے زیادہ عیسائیت سے خائف رہتے تھے اور مختلف ادوار میں عیسائیوں نے ان پر خوب ظلم ڈھائے ہیں۔لیکن اس کے برعکس میں یہ بھی کہوں گا کہ مسلم حکومتوں کے اَدوار میں یہودی پکنک تو نہیں مناتے تھے، مگر بہتر حالات میں تھے۔اگر اس قدر خوں ریز تاریخ کے ہوتے ہوئے بھی عیسائی اور یہودی ایک دوسرے کو معاف کر کے مفاہمت کا راستہ اختیار کر سکتے ہیں، تو آخر اسلام اور یہودی کیوں نہیں''۔

صدر ٹرمپ اور ان کے معاونین کی طرف سے فلسطینی مسئلے کا جو فارمولا فی الحال منظرعام پر آیا ہے، اس سے شاید ہی امن کی امید بندھ سکتی ہے۔خدشہ ہے کہ یہ اس خطے کے لیے مزید پیچیدگیاں پیدا نہ کر دے۔اس کے اہم نکات یہ ہیں کہ مغربی کنارہ وغزہ پر مشتمل علاقے کو نئی فلسطینی اسٹیٹ قرار دینا ہے۔فلسطینی مہاجرین کی اپنے گھروں کو واپسی کا معاملہ ہمیشہ کے لیے بند ہوجائے گا۔یا تو ان کو اس نئی فلسطینی اسٹیٹ میں رہنا ہوگا یا جس ملک میں مقیم ہیں وہیں ضم ہونا پڑے گا۔

۱۹۹۳ء میں اوسلو میں اسرائیلی اور فلسطینی قیادت کے درمیان طے پائے گئے سمجھوتے میں ایک فلسطینی اتھارٹی کا قیام عمل میں آیا تھا اور ۴۰ لاکھ کی آبادی کو دو خطوں مشرق میں غزہ اور اُردن کی سرحد سے متصل مغربی کنارے میں تقسیم کیا گیا تھا۔نسبتاً وسیع مغربی کنارے کا انتظام الفتح کی قیادت کی حامل فلسطین لبریشن آرگنائزیشن، یعنی پی ایل او کے پاس ہے اور غزہ میں اسلامک گروپ حماس برسرِ اقتدار ہے۔ جہاں پی ایل او اسرائیل کو تسلیم کرتا ہے، وہاں حماس فلسطینی بستیوں میں بسائی گئی یہودی ریاست کے وجود سے انکاری ہے۔ چونکہ مغربی کنارہ اور غزہ کے درمیان کوئی زمینی رابطہ نہیں ہے، اس لیے ان کو منسلک کرنے کے لیے اسرائیلی علاقوں سے ۳۰ میٹر اُوپر ایک ۱۰۰ کلومیٹر طویل فلائی اوور بنایا جائے گا، جس کے لیے چین سے رابطہ کیا جارہا ہے۔

متوقع معاہدے کی رُو سے اسرائیل مرحلہ وار فلسطینی قیدیوں کی رہائی عمل میں لائے گا اور

اس میں تین سال کا عرصہ لگ سکتا ہے۔ القدس یا یروشلم شہر کو تقسیم نہیں کیا جائے گا، بلکہ اس کا کنٹرول اسرائیل کے پاس ہی رہے گا۔ شہر میں مکین عرب مسلمان اسرائیل کے بجاے فلسطین کے شہری ہوں گے۔ ان کی بہبود، تعلیم وصحت کے لیے نئی فلسطینی اسٹیٹ اسرائیلی بلدیہ کو رقوم فراہم کرے گی۔ الاقصیٰ حرم پر جوں کی توں پوزیشن برقرار رہے گی، یعنی یہ بدستور اردن کے اوقاف کے زیرنگرانی رہے گا۔ ویسے سعودی عرب اس کے کنٹرول کا متمنی تھا، تاکہ ریاض میں موجود فرماں روا بھی تین حرمین، یعنی مکہ، مدینہ ومسجد اقصیٰ کے متولی یا خادم قرار پائیں۔

اسرائیل، مسجد اقصیٰ کے تہہ خانے تک رسائی کا خواہش مند ہے۔ جس کے لیے اس نے مغربی سرے پر کھدائی بھی کی ہے، تاکہ وہاں تک پہنچنے کے لیے مسجد کی دیواروں کے نیچے سے ایک سرنگ بنا سکے۔ یہودیوں کا عقیدہ ہے کہ تہہ خانے میں ہی معبد سلیمان کے کھنڈرات موجود ہیں۔ اس کے علاوہ مصر، فلسطینی ریاست کے لیے ایر پورٹ، کارخانہ لگانے اور زراعت کے لیے زمین فراہم کرے گا، مگر اس زمین پر فلسطین کے مالکانہ حقوق نہیں ہوں گے، نہ وہ اس پر بس سکیں گے۔ امریکا، یورپی یونین اور خلیجی ممالک اگلے پانچ سال تک فلسطینی ریاست کو انتظام وانصرام کے لیے ۳۰؍ارب ڈالر کی رقم فراہم کریں گے۔ اس میں ۷۰ فی صد خلیجی ممالک، ۲۰ فی صد امریکا اور ۱۰ فی صد یورپی ممالک دیں گے۔ یہ رقم ہر سال ۶؍ارب ڈالر کی صورت میں خرچ کی جائے گی۔ نئی فلسطینی حکومت فوج نہیں رکھ سکے گی، مگر ایک پولیس فورس تشکیل دے سکے گی۔ اس کی سرحدوں کی حفاظت اسرائیل کی ذمہ داریوں میں شامل ہوگی۔ صدی کی اس ڈیل پر دستخط ہونے کے بعد حماس اپنے تمام ہتھیار مصر کو سونپ دے گا۔ ایک سال کے اندر انتخابات ہوں گے۔ غزہ کے راستے اسرائیل اور مصر کی سرحدیں نقل وحمل اور تجارت کے لیے کھول دی جائیں گی۔ اسی طرح اردن اور مغربی کنارے کی سرحد کی تین چیک پوسٹیں فلسطینی حکام کے حوالے کی جائیں گی۔

اس پورے معاہدے میں ترکی کے کردار کا کوئی ذکر نہیں ہے، جس نے پچھلے سال اقوام متحدہ کی جنرل اسمبلی میں القدس یا یروشلم کو اسرائیلی دارالحکومت قرار دیے جانے کے فیصلے کے خلاف ووٹ ڈلوانے میں قائدانہ کردار ادا کر کے امریکا کے فیصلے کی سینہ تان کر مخالفت کی تھی۔ چند برس قبل امریکی صدر بارک اوباما کی حوصلہ افزائی پر مسلم ممالک سعودی عرب، مصر اور ترکی نے مصالحت کا

کردار ادا کر کے حماس کو قائل کرلیا تھا کہ وہ مغربی کنارے کی محمود عباس کی قیادت والی فلسطینی اتھارٹی اور اسرائیل کے درمیان کسی بھی مجوزہ براہِ راست بات چیت میں روڑے نہیں اٹکائے گا اور نہ بات چیت میں شریک افراد کو غداری وغیرہ کے القابات سے نوازے گا۔ تاہم، اس سعی سے اگر معاہدے کی صورت میں کوئی نتیجہ برآمد ہوتا ہے تو درحقیقت یہ طے ہوا تھا کہ فلسطینی علاقوں میں ریفرنڈم کرایا جائے گا اور عوامی قبولیت کی صورت میں سبھی فریقوں کو منظور ہوگا۔

دو سال قبل دوحہ میں راقم کو مقتدر فلسطینی لیڈر خالد مشعل سے ملاقات کا شرف حاصل ہوا۔ جب میں نے ان سے پوچھا کہ: ''آپ تو دو ریاستی فارمولے کو رد کرتے ہیں اور اسرائیل کے وجود سے ہی انکاری ہیں، تو مفاہمت کیسے ہو؟'' انھوں نے کہا: ''حماس کا رویہ کسی بھی طرح امن مساعی میں رکاوٹ نہیں ہے۔ یاسر عرفات اور محمود عباس نے تو اسرائیل کو تسلیم کیا، مگر ان کے ساتھ کیا سلوک ہوا؟ تحریک میں شارٹ کٹ کی گنجایش نہیں ہوتی۔ اس کو منطقی انجام تک پہنچانے کے لیے استقامت ضروری ہے۔ اپنے آپ کو مضبوط بنانا اور زیادہ سے زیادہ حلیف بنانا بھی تحریک کی کامیابی کے لیے ضروری ہے۔ تاریخ کا پہیہ سست ہی سہی مگر گھومتا رہتا ہے''۔ تاہم، اس کے ساتھ ہی انھوں نے یہ بھی کہا کہ: ''حماس ۲۰۰۶ء کے 'نیشنل فلسطین اکارڈ' پر کاربند ہے، جس کی رُو سے وہ دیگر گروپوں کے ذریعے اسرائیل کے ساتھ مذاکرات کی راہ میں رکاوٹ نہیں بنے گی، مگر مجھے یہ بھی یقین ہے کہ ان مذاکرات کا کوئی مستقبل نہیں ہے۔ کمزور اور طاقت ور کے درمیان کوئی معاہدہ ہو ہی نہیں سکتا۔ سیاسی لحاظ سے ہمیں طاقت ور بننے کی ضرورت ہے''۔

چند برس قبل ان علاقوں کا دورہ کر کے میں نے محسوس کیا کہ عرب ممالک اور امریکی امداد کے بدولت غزہ کے مقابلے میں مغربی کنارے میں خاصی خوش حالی اور ترقی نظر آتی ہے۔ جریکو قصبے میں ایک عالی شان کیسینو (جوا خانہ) کے علاوہ مختلف شہروں رملہ، جَبرون (الخلیل)، بیت اللحم میں نئے تھیٹر کھل گئے ہیں، جہاں تازہ ترین ہالی وڈ فلمیں دیکھنے کے لیے بھیڑ لگی ہوتی ہے۔ جریکو کے کیسینو میں اسرائیلی علاقوں سے جوئے کے شوقین یہودی بھی داؤ لگانے کے لیے ہر رات پہنچ جاتے ہیں۔ حضرت عیسیٰؑ کی جاے پیدایش بیت اللحم کے چرچ آف نیٹیوٹی یا کنیستہ المھد اور یروشلم کے درمیان مشکل سے ۱۰ کلومیٹر کا فاصلہ ہے، مگر وہاں کے مکینوں کے لیے یہ صدیوں پر

محیط ہے۔ وہ اسرائیلیوں کی اجازت کے بغیر یروشلم نہیں جاسکتے ہیں۔ وہ صرف دُور سے اس شہر کو دیکھ سکتے ہیں۔

اقوام متحدہ کے زیرانتظام ایک اسکول کے استاد نے بتایا کہ: ''چودہ سال قبل، میں ایک بار یروشلم گیا تھا اور مسجد اقصیٰ میں نماز ادا کی تھی''۔ اسرائیلی حکومت نے فلسطینی علاقوں کو محصور کر کے ایک مضبوط دیوار کھڑی کی ہے۔ یروشلم سے بحرمُردار (Dead Sea) جانے کے لیے یہودیوں اور فلسطینیوں کے لیے دو الگ راستہ بنائے گئے ہیں اور ان کے بیچ میں اونچی دیوار ہے۔ یہ نسل پرستی کا ایک بدترین مظاہرہ ہے۔ اردن اور فلسطین کے درمیان بحرمُردار میں نمک کی مقدار ۳۰ فی صد سے زیادہ ہے، اس لیے اس میں کوئی ذی روح زندہ نہیں رہ سکتا۔ یہ وہی سمندر ہے جس میں حضرت لوطؑ کی قوم تباہ و برباد ہوگئی تھی۔ یہ علاقہ سطح سمندر سے ۴۰۰ میٹر نیچے ہے۔ چونکہ اس سمندر میں کوئی ڈوب نہیں سکتا، یہاں سیاح آرام سے پانی کی سطح پر لیٹ کر اخبار وغیرہ کا مطالعہ کر سکتے ہیں۔ اسرائیل کی ایک کثیر ملکی کمپنی اس سمندر سے کان کنی کر کے دنیا بھر میں جلد کی خوب صورتی اور علاج کے لیے Dead Sea Products سپلائی کرتی ہے۔ اس بحر کی تہہ کو جلدی امراض کے علاج کے لیے استعمال کرنے کا سہرا کراچی سے منتقل ہونے والے پاکستانی یہودی سائنس دان زیوا گلاڈ کے سر ہے۔

اسرائیلی علاقوں کے رکھ رکھاؤ اور ترقی دیکھ کر جہاں یورپ اور امریکا بھی شرما جاتا ہے، وہیں چند کلومیٹر کے فاصلے پر ہی فلسطینی علاقوں کی کسمپرسی دیکھ کر کلیجہ منہ کو آتا ہے۔ سیاحوں کو دیکھ کر بھکاری لپک رہے ہیں، نوعمر فلسطینی بچے سگریٹ، لائیٹر وغیرہ کچھ ایسی چیزیں بیچنے کے لیے آوازیں لگا رہے ہیں۔ ایک جم غفیر نے پانی کے ایک ٹینکر کے آس پاس حشر برپا کیا ہوا تھا۔ پھول جیسے بچے کتابوں کے بستوں کے بجاے پینے کے پانی کے حصول کے لیے دھینگا مشتی کر رہے تھے۔ شہر کے گورنر صالح التماری سے جب استفسار کیا، تو ان کا کہنا تھا، کہ: ''پانی کے سبھی ذرائع پر اسرائیل کا قبضہ ہے اور وہ صرف ایک مقدار تک فلسطینی علاقوں میں پانی فراہم کرتے ہیں۔ کبھی کبھی ہفتوں تک ٹینکر نہیں آتا ہے''۔ ان کے مطابق: ''اسرائیل نے کربلا جیسی کیفیت برپا کی ہوئی ہے''۔

گورنر سے ملاقات کے بعد جب ہمارے وفد کے دیگر اراکین مارکیٹ میں خرید و فروخت

کر رہے تھے، میں چند فلسطینی نوجوانوں سے گفتگو کر رہا تھا۔ ان میں سے ایک نوجوان گورنر کے ساتھ ہماری بریفنگ میں بھی موجود تھا۔ اس نے کہا، کہ: ''کیا آپ جاننا چاہتے ہیں کہ پانی آخر کہاں جاتا ہے اور عوام تک کیوں نہیں پہنچتا ہے؟'' جب میں نے ہاں کہا، تو اس نے مجھے اپنے موٹر سائیکل پر بیٹھنے کے لیے کہا۔ چند لمحوں کے تذبذب کے بعد میں اللہ کا نام لے کر سوار ہو گیا۔ بعد میں اس جرأت کا خمیازہ مجھے واپسی پر تل ابیب ایئرپورٹ پر بھگتنا پڑا۔ جب وہاں سیکورٹی اہلکار نے یہ کہہ کر مجھے چونکا دیا، کہ: ''تم اپنے ساتھیوں کو چھوڑ کر ایک فلسطینی کے موٹر سائیکل پر کہاں گئے تھے؟''

خیر چند گلیوں سے گزرنے کے بعد ہم ایک پوش علاقے میں وارد ہو گئے تو اس نوجوان نے کہا کہ: ''فلسطینی اتھارٹی کے عہدے داران اسی علاقے میں رہتے ہیں''۔ ایک عالی شان مکان کے گیٹ کے باہر موٹر سائیکل روک کر اس نے گھنٹی کا بٹن دبایا اور عربی میں آواز بھی لگائی۔ خیر کسی نے دروازہ کھول کر علیک سلیک کے بعد اندر جانے دیا۔ مکان کے مالک شاید موجود نہیں تھے۔ جس نے بھی دروازہ کھولا تھا، وہ ملازم ہی لگ رہا تھا۔ مکان کے اردگرد وسیع باغیچہ اور ایک وسیع سوئمنگ پول بنا تھا۔ ایک اور مکان کا بھی یہی حال تھا۔ معلوم ہوا کہ مکین یا تو رملہ میں یا بیرون ملک دورے پر گئے ہیں۔ کربلا جیسے حالات میں جہاں عام فلسطینی العطش کی صدائیں بلند کر رہا تھا، لیڈروں کے ذریعے پانی کا یہ ضیاع تکلیف دہ مشاہدہ تھا!